ہندوستان کے متعلق جاحظ کی اجمالی معلومات کا تفصیلی مطالعہ

جناب ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی صاحب - حیدرآباد دکن

(۵)

ہندوؤں کے جائز و ناجائز جنسی تعلقات کے بارے میں جاحظ نے جو کچھ ثبت کیا ہے اردو تہذیب اس کو اپنا لباس مستعار دینے کے لئے تیار نہیں معلوم ہوتی۔ یہاں اس کو اصل الفاظ ہی میں درج کرنے کا مقصد ہندوؤں کی اس خصوصیت سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک ایسے شخص کی شہادت سے روشناس کرانا ہے جو نہایت بے لاگ ومحتاط تھا تاریخی وثیقہ ہونے کی حیثیت سے یہ اپنی اہمیت آپ ہی ظاہر کر رہا ہے۔

قال ابوالعباس - ختن ابی اسحاق ابراهیم بن سیّار النظام : اعرف الحظوة من خلوة النساء - لا یکون الحظ الا فی نتاج شکلین متباینین فالتقاؤهما هو الاکسیر المودّی الی الخلاص : وهو ان تزاوج بین هندیة وخراسانیّ ، فانها لا تلد الا الذهب الابریز ولکن احرس ولدها ، ان کان الولد انثی فاحذر علیها من شدة لواط رجال خراسان وزناء نساء الهند ، واعلم انّ شهوتها للرجال علی قدر حظوتها عندهم واعلم انّها ستساحق النساء علی اعراق الخراسانیة وتزنی بالرجال علی اعراق الهند ، واعلم انّه ممّا یزید فی زناها ومساحقتها معرفتها بالحظوة عند الزناة وبالحظ عند السحاقات (۱۷۵)

وزعم جناب بن الخشخاش القاضی، انه احصی فی قریة (واحدة) النساء المختونات والمعبرات ، فوجد اکثر العفائف مستوعبات واکثر الفواجر معبرات ، وان نساء الهند والروم وفارس انما صار الزنا وطلب الرجال فیهن اعم ، لانّ شهوتهنّ للرجال اکثر ولذلک

اتخذ الھند دُورَ اللزوانی ۔ قالوا: ولیس لذلك علّة الاوفارة البظر والقلفہ والھند توافق العرب فی کلّ شئ الّا فی ختان النساء والرجال ودعاھم الی ذلك تعمقھم فی توفیر حظ الباہ ۔ قالوا: ولذلك اتخذوا الادویة وکتبوا فی صناعة الباہ کتبا ودرسوھا الاولادَ (۱۷۶)

۱۳

آپ نے بھی پڑھا یا سنا ہوگا کہ عربوں کو اپنی زبان پر ایسا غرّہ تھا کہ وہ اپنے سوا تقریبًا سبھوں کو بے زبان اور گونگا سمجھتے تھے۔ اس دعوے کا صحیح یا غلط ہونا تو وہی شخص بتا سکتا ہے جو دو تین ترقی یافتہ زبانوں کے علاوہ عربی ادب پر بھی کماحقہٗ عبور رکھتا ہو۔ ہم جیسے عامی اتنا تو یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آنے کے بعد عربوں ہی نے اس ادعا کو مبالغہ آمیز قرار دیا۔ عربی ادب کے امام اعظم ابوعثمان عمر بن بحر جاحظ ہی کو دیکھیے، اپنی لاثانی ولافانی کتاب البیان والتبین میں (تبیّن بروزن تخیّل وتیقّن نہ کہ بروزن تفصیل وتشریح) زبان آوری اور بلاغت میں رومیوں، فارسیوں اور ہندیوں کو بھی عربوں کا بڑی حد تک ہم سر و ہم پلّہ بتاتے ہیں، صاف صاف لکھا کہ اقوام عالم میں جو قومیں قابل شمار وقطعاً اور اخلاق وادب، حکمت اور علم میں ممتاز ہیں وہ صرف چار ہی ہیں۔ عرب و ہند اور فارس و روم پھر رومیوں اور فارسیوں وغیرہ کا نظریۂ بلاغت کا ذکر غالبًا غیر اہم سمجھ کر ایک ایک دو دو سطروں میں ختم کر کے ہندیوں کا نظریہ تفصیل سے نقل کیا ہے، اور آخر میں ایک قدیم ہندی عالم کے لکھے ہوئے بقامت کہتر لیکن بقیمت بہتر رسالہ کا عربی ترجمہ دیا ہے۔ جاحظ کا نقل کردہ یہ صحیفہ اجمالی ہونے کے باوجود جتنا ماقلّ و دلّ ہے اس کا اندازہ تو غور سے پڑھنے والے قاری کر ہی لیں گے اس لئے انھیں اس طرف متوجہ کرنا چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا البتہ بلاغ و بلاغت کا فرق پیش نظر رہنا غالبًا نامناسب نہ رہے گا۔

بلغ یبلغ بلوغًا بلاغًا (باب نصر) کسی شے تک پہونچنا خصوصًا مطلوب ومقصود تک۔ خواہ یہ مادی ہو یا غیر مادی بلغ یبلغ بلاغة (باب کرم): پہونچنے والا ہونا یعنی ان اسباب و وسائل کا ہونا جو مقصود تک پہونچا سکیں۔ بلاغ و بلاغت کے اس فرق کے باوجود بعض مرتبہ بلاغت بطور توسیع بلاغ کے معنی میں

بھی مستعمل ہو لیکن سیاق و سباق سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں کونسے معنی مراد ہیں ۔

چونکہ انسان اپنی مقصد برآری کے لئے اپنا مافی الضمیر دوسروں تک اکثر و بیشتر زبان (نطق کلام) ۲۲
کے ذریعہ پہونچاتا ہے اس لئے اس وسیلہ کے عناصر یا اجزاء (بلاغت) جتنے زیادہ موزوں و مناسب ہونگے پہنچ یعنی بلاغ کا نفوذ و تاثیر بھی اتنی ہی زیادہ اور یقینی ہوگی ۔ جب یہ کہا جاتا ہے فلاں کام بلیغ ہے تو اس کا مفہوم ہوگا وہ کلام باعتبار مقصد براری مفید، باعتبار اقدار انسانی اچھا اور باعتبار جمال خوب ہے ۔

بلاغت کے ہندی نظریوں کی جو تفصیل آگے آرہی ہے اس میں حسب توقع بار بار "الفاظ" کا ذکر آئے گا مثلاً یہ کہ لفظ موقع کے لحاظ سے موزوں اور محل کے لحاظ سے مناسب ہو وغیرہ ۔ اس لئے سب سے الفاظ کے متعلق ۲۳
ہندیوں کی رائے معلوم کرنے کا اشتیاق برمحل ہے ۔ قاریوں کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ اس سلسلہ میں جاحظ نے ہندیوں کی رائے اپنی کتاب الحیوان میں ہمارے لئے محفوظ کردی ہے اور یہ اُس نے البیان سے پہلے قلمبند کی تھی ۔ محولہ وثیقہ کا تشریحی ترجمہ یہ ہے ۔

اہل ہند کا خیال ہے کہ الفاظ کی شکل و صورت اور اُن کا صوت و آہنگ لوگوں کے کام و دہن کی ساخت اور اُن کے طبعی ماحول کا نتیجہ ہوتے ہیں اور وقت و مقام کی ضرورت کے مطابق ان میں مناسب تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کی قلت و کثرت دراصل اس زبان کے بولنے والوں کی ضرورتوں پر منحصر ہے ۔ باعتبار نوعیت جس قوم کی ضرورتیں جتنی زیادہ ہوں گی اشیاء بھی اتنی ہی زیادہ پیدا ہوتی جائیں گی اور اشیا کی کثرت، اسماء کی کثرت کا سبب بنے گی ۔ اس طرح اشیاء کی کثرت سے ان کے تعامل میں زیادتی ہوگی اور تعامل کی کثرت افعال کی کثرت کا موجب ہوگی اور اس سے افہام و تفہیم کی سہولت بڑھتی جائے گی ۔ اور جب اشیاء کا علم بڑھتا جائے گا تو غور کرنے اور سوچنے کا دائرہ بھی لامحالہ وسیع ہوتا جائے گا اور غور و فکر میں زیادتی سے فکر میں وسعت کے ساتھ اس کی گہرائی بھی بڑھتی جائیگی (۱۰۰)

الفاظ کے متعلق ہندیوں کے یہ خیالات جب عرب ادیبوں کے سامنے آئے تو قدرتاً انھیں ہندی بلاغت کے اصول و مبادی جاننے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ وہ ان ہندی عالموں کی طرف رجوع ہوئے جو اس وقت بغداد میں موجود تھے ۔ غالباً بیت الحکمۃ میں مختلف عالموں اور ادیبوں کی محفل جمی ہوئی تھی کہ ایک عرب

ادیب نے ایک ہندی عالم سے پوچھا: آپ کے یہاں بلاغت کا کیا مفہوم ہے؟ اس ہندی نے کہا: مقصد کی جانب واضح راہ نمائی، وقت کی مناسبت اور مقام کی موزونی سے استفادہ اور غایت کی طرف اشارہ کی خوبی (۱۷۸)

بعض اور ہندیوں سے بلاغت کی تعریف دریافت کی گئی تو انھوں نے کہا کہ مقصد تک پہنچنے کے سارے وسائل کو جمع کرنے والی صرف دو چیزیں ہیں۔ حجت کی بصیرت اور مناسبتِ موقع و موزونیتِ محل کی پہچان۔

بہت سے عالموں کے متفق علیہ طور پر بیان کی ہوئی یہ تعریف اتنی مجمل بلکہ مختصر تھی کہ مبہم معلوم ہوتی تھی اس لئے اس کی توضیح ایک دوسرے ہندی عالم نے اس طرح کی ہے:

حجت کی بصیرت اور مناسبتِ موقع و موزونیتِ محل کی پہچان کا مفہوم یہ ہے کہ مقصد کا واضح اظہار کرنے کی بجائے کنایہ سے کام لیا جائے بشرطیکہ اظہار کی راہ دشوار گذار و ناہموار نظر آئے۔ اظہار سے صرفِ نظر کرنا بارہا حصولِ مقصد میں نہایت موثر اور کامیابی میں حد درجہ یقینی ثابت ہوتا ہے۔ اسی ہندی حکیم نے ایک دوسرے موقع پر وضاحت کی کہ:-

موزوں محل سے فائدہ اٹھانا، گفتگو کے مناسب موقع کو غنیمت جاننا پیچیدگی یا التباس میں ڈالنے والے موضوع سے کم سے کم گھبرانا، جن الفاظ پر قابو نہ ہو یا جن کے ادا کرنے میں معذوری ہو ان سے کم سے کم دہشت زدہ ہونا بس یہی چیزیں بلاغت کے جملہ اصول و فروع کی جامع ہیں۔

ایک اور موقع پر غالباً اسی ہندی عالم و ادیب نے خطبہ اور خطیب کی جو خصوصیتیں گنائی ہیں حق یہ ہے کہ ان سے بہتر خصوصیتیں بیان کرنا ناممکن نہ سہی، انتہائی دشوار ضرور ہے، وہ کہتا ہے: بلاغت کے مذکورہ صدر وصف کی زینت، اس کی بہا، اس کی شیرینی اور اس کی رونق یہ ہے کہ خطیب خوش شمائل ہو، اس کے الفاظ معنی کے لحاظ سے جامع و مانع، جملے متناسب اور لہجہ صاف ہو۔ اگر اس کے ساتھ عمر، ہیئت، خوش روئی اور طویل خاموشی بھی جمع ہو جائے تو پھر فی الواقع و فی الحقیقت خطبہ و خطیب دونوں کے دونوں کامل و مکمل ہیں ایسے کامل و مکمل کہ علمائے دہر مبہوت اور ادبائے عصر مدہوش ہو کر بے اختیار پکار اٹھیں یہ ہے جادو!

اس ہندی نے خطیب کے جو اوصاف وخصائل بتائے ہیں اُن میں طویل خاموشی کی خصلت جن لوگوں کو بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے وہ ایک دوسرے ہندی کے دو بول سنیں اور سر دُھنیں ۔

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے ناز اس کو کمال پر ذرا کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے ایک خلق خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

حکمائے ہند کے مندرجہ بالا اقوال جاحظ سے ابوالزبیر نے اپنی عمر کے غالباً آخری زمانے میں نقل کئے تھے ابوالزبیر دوسری صدی ہجری کے ربع اوّل میں کوفہ کے عامل خراج محمد بن حسان کا معتمد و کاتب تھا لیکن بڑی عمر پائی اور مامون کے دورِ خلافت تک زندہ رہا۔ یہی روایتیں جاحظ سے ایک دوسرے کاتب محمد بن ابان نے بھی بغیر کسی کمی بیشی کے بیان کی تھیں۔ دونوں راوی ثقہ معلوم ہوتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جو اقوال انھوں نے نقل کئے ہیں ہندیوں کی طرف ان کی نسبت مشکوک سمجھی جائے ۔

حسب توقع بلاغت کے ان ہندی اصول پر بیت الحکمۃ میں بحثیں ہوئیں۔ بحث میں حصہ لینے والوں میں ممکن ہے ہندی علما بھی موجود ہوں روایت کے الفاظ سے تو ایسا ہی متبادر ہوتا ہے جن عالموں اور ادیبوں نے ان اصول پر اپنی رائیں ظاہر کیں ان میں بیت الحکمۃ کا ناظم ابوعمر سہل بن ہارون (متوفی ایک سو تہتر ہجری) بھی تھا۔ علم و ادب میں سہل بن ہارون کا مقام اتنا اونچا تھا کہ جو لوگ اس کی رایوں سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے وہ بھی اس کے خیالات توجہ سے سنتے اور اُن کی قدر کرتے تھے شائد اس لئے ہندی اصول بلاغت پر جاحظ نے اس کی تنقید محفوظ کر دی ہے جو اردو میں کچھ اس طرح ہے ۔

اگر دو شخصوں نے خطبہ دیا یا گفتگو کی، مباحثہ کیا یا کچھ بیان کیا اور اُن میں ایک خوبصورت و بارونق خوش پوش و صاحب حسب و شرف ہے اور دوسرا حقیر و نحیف، بدہیئت و بدشکل اور گم نام و ناشناسا سا مگر بلاغت میں ان دونوں کا کلام ہم پلّہ اور حق و صواب میں ہم وزن ہو تو ایک کو دوسرے پر فضیلت دینے میں ممکن ہے کہ دو گروہ ہو جائیں لیکن ان کی اکثریت نحیف و بدشکل کو شریف و جسیم اور بدہیئت کو ذی ہیئت پر ترجیح دے گی۔ حقیر و نحیف سے ان کی خوشنودی اس کے خوش پوش و ذی ہیئت ساتھی کو اس کا ہم درجہ و ہم رتبہ سمجھنے میں مانع ہوگی۔ گم نام و ناشناسا سے ان کی گرویدگی اس پر تعجب کرنے کا باعث ہوگی اور اس

کی شان میں اضافہ اس کی ستائش میں مبالغہ کا سبب بنے گا کیونکہ لوگ اس کو حقیر و بے مایہ سمجھ رہے تھے اظہار و بیان کی اس سے بالکل توقع نہیں رکھتے تھے اور اس پر حسد کرنے کا تو انھیں خیال بھی نہیں آیا تھا، جب اچانک لوگوں نے ایسا کلام سنا جس کا اُن کو سان و گمان بھی نہیں تھا اور جو بات ظاہر ہوئی وہ اُن کے اندازہ و قیاس کے بالکل خلاف تھی تو اُس کے کلام کا حُسن اُن کے نزدیک دوگونہ ہوگیا اور وہ اُن کی نظر میں خلاف توقع یکایک بہت بلند ہوگیا کیونکہ جب کوئی شے ایسے مقام پر پائی جائے جہاں وہ عموماً نہیں ہوا کرتی تو زیادہ نادر معلوم ہوتی ہے اور جو شے جتنی زیادہ نادر ہوگی وہ تصوّر پر اتنی ہی زیادہ اثر انداز ہوگی اور تصوّر پر جتنی زیادہ اثر انداز ہوگی اتنی ہی زیادہ دلفریب ہوگی اور جتنی زیادہ دلفریب ہوگی اتنی ہی زیادہ عجیب ہوگی اور جتنی زیادہ عجیب ہوگی اتنی ہی زیادہ بدیع بھی ہوگی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ بچّوں کی باتوں میں نوادر اور دیوانوں کی بکواس میں ظرائف ہوتے ہیں کیونکہ سامعین ان سے زیادہ لطف اندوز ہوتے اور ان پر زیادہ تعجب کرتے ہیں۔ غرابتِ بعید کی توقیر اور ندرت و بداعت کی تعظیم انسان کی فطرت میں داخل ہے، جو چیزیں انسان کے قابو میں ہیں، اس کی ملکیت میں ہیں، وہ اس کے نزدیک اتنی گراں قدر نہیں ہوتیں جتنی کہ دوسروں کی مملوکہ اشیاء ہوتی ہیں۔ جو چیزیں اس کے قبضہ میں ہیں ان سے وہ ایسی دلچسپی نہیں رکھتا جیسی کہ قلیل و کمیاب سے رکھتا ہے جو چیزیں اس کے زیر تصرف ہیں اُن سے اُس کو ایسا شغف نہیں ہوتا جیسا کہ شاذ و نادر سے ہوتا ہے۔ اسی لئے تو ہم محلہ کے لوگ اپنے پاس پڑوس کے عالم کی قدر نہیں کرتے، دوست احباب آپس میں ایک دوسرے کے ہُنر سے جو استفادہ نہیں کرتے اس کی علّت بھی یہی ہے۔ لوگ نو وارد سے دلچسپی لیتے ہیں مگر جو اُن سے دور دور رہتا ہے اُس کے یہاں جایا کرتے ہیں، اس کا سبب بھی یہی ہے جس شخص کے افادہ کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اس سے استفادہ بھی زیادہ مشکل نہیں اور جو علم و ہنر میں زیادہ ماہر اور فیض رساں ہے اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تو اس کی وجہ بھی یہی ہے اسی لئے تو لوگ خاندانی اصالت پر ذاتی شرافت کو اور وراثتی مالدار پر خود کوش دولت مند کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔

بعض ایسے علماء جو سہل کے مخالف ہوں اور جنھوں نے اس کو نہیں دیکھا اس تنقید سے اس شبہ میں پڑ سکتے ہیں کہ شاید وہ خود حقیر و بدہیئت تھا اسی وجہ سے ہندی حکیم کی رائے کی تردید کی ہے اس لئے جاحظ

نے یہ وضاحت کرنی ضروری سمجھی کہ سہل بذات خود روشن رو، وجیہہ، خوش قامت وقبول صورت تھا۔ تجربہ ہونے سے پہلے ہی لوگ فقط اس کو دیکھ کر اس کے حکیم ہونے کا یقین کر لیتے۔ گفتگو کرنے سے قبل ہی اس کا ذہین ہونا باور کر لیتے، آزمائش کے بغیر ہی اُس کا باریک بیں ہونا سمجھ جاتے اور امتحان کرنے سے پیشتر ہی اس کا شریف ہونا تاڑ لیتے تھے۔ ہندی عالم نے ایک اعلیٰ درجہ کے خطیب کے جو اوصاف گنائے ہیں وہ سب سہل میں موجود تھے لیکن اس کے باوجود اس کے لئے یہی اوصاف ایسی باتیں کہنے میں ہارج نہیں ہوئے جنھیں وہ صحیح سمجھتا تھا۔ اس کی انصاف پسندی کی داد دینی چاہیئے کہ حقیر کو شریف پر ترجیح دینے کے جو اسباب اس نے بتائے ہیں ان سے خود اس کی تنقیص نکلتی تھی مگر یہ چیز بھی حق گوئی میں اس کے لئے مانع نہیں ہوئی۔

سہل کی تنقید کے سلسلہ میں صرف یہ کہنا ہے کہ اُس نے ہندیوں کے اصول بلاغت سے کوئی اختلاف نہیں کیا بلکہ ہندیوں نے اعلیٰ درجہ کے خطیب کے جو ذاتی و اضافی اوصاف شمار کئے تھے صرف انھیں کے متعلق رائے زنی کی ہے۔

بلاغت کے جس ہندی رسالہ کا اوپر ذکر آیا تھا وہ جاحظ کو اس کے معاصر بزرگ، کئی بلند پایہ عالموں کے استاذ اور اپنے فرقہ کے امام ابوالاشعث معمر بن عباد متوفی دوسو پندرہ ہجری، نے سنایا تھا، معمر کا بیان ہے کہ یحییٰ بن خالد کے بلائے ہوئے ہندی حکیموں میں بھلہ نامی ایک طبیب سے میں نے ایک روز پوچھا کہ ہندیوں کے یہاں بلاغت کا کیا مفہوم ہے تو اس نے کہا کہ اس موضوع پر قلم بند کیا ہوا ہمارے یہاں (یعنی بغداد میں) ایک صحیفہ موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ میں عربی میں اس کا کما حقہٗ ترجمہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس فن میں کوئی بصیرت نہیں رکھتا اس لئے اس کی خصوصیتوں کی ترجمانی کر سکتا ہوں اور نہ اس کے دقیق معنیٰ اور لطیف مطالب کو بیان کرنا میرے بس کی بات ہے، معمر کہتے ہیں کہ میں نے ہندیوں سے یہ صحیفہ حاصل کیا اور سنسکرت سے ترجمہ کرنے والے مترجموں کے پاس پہونچا۔ ترجمہ سے معلوم ہوا کہ بلاغت کے موضوع پر لکھا ہوا یہ صحیفہ ان معنوں پر مشتمل تھا۔

بلاغ یعنی اثر و تاثیر کے لئے سب سے پہلے اس کے اسباب کا فراہم ہونا ضروری ہے (جو اسباب

وہبی اور خلقی ہیں وہ یہاں غیر متعلق ہیں کیونکہ ان کی ضرورت یا لبداہت ثابت ہے کسبی اسباب بہت سے ہیں) ازاں جملہ خطیب کے دل کی مضبوطی، اس کے اعضا کا سکون، اس کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ میں کمی اور اس کے بشرہ پر تغیر کی قلت نہایت ضروری ہے (خطیب کو پریشان، دہشت زدہ یا مرعوب نہ ہونا چاہیئے جس سے کلام میں روانی کے بجائے عجلت اور سلاست کی بجائے رکاوٹ پیدا ہو جائے گی، زبان لٹ پٹانے اور ہاتھ کانپنے لگیں گے) خطیب کو اپنے مطلب کے مطابق الفاظ اختیار کرنے میں پوری مہارت ہونی چاہیئے، لونڈیوں کی مالک سے مخاطبت ہو تو لونڈیوں کی زبان بولے اور نہ بادشاہوں کے حضور بازاریوں کی ۔ اس میں ایسی صلاحیت ہونی چاہیئے جو ہر طبقہ کی مناسبت سے بولی جائے اور ان سے بہرحال ہم رنگ وہم آہنگ ہوتی رہے اس کا کلام دقیق و لطیف معنی کا حامل ضرور ہو لیکن نہ اتنا کہ بغیر غور و فکر کے کسی کی سمجھ میں نہ آئے (اور سامعین دل ہی دل میں کہنے لگیں: -

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنی عالم تقریر کا

ادق و مغلق یا مخصوص کلموں سے اجتناب کرنے میں اتنا مبالغہ نہ کرے کہ عام، مانوس اور سہل الفاظ بھی چھوٹ جائیں۔ الفاظ صاف ستھرے سلیس و سُریلے ضرور ہوں لیکن ان کے انتخاب میں اتنا غلو نہ کیا جائے کہ ان کا ذخیرہ گھٹ کر نہایت محدود ہو جائے۔ الفاظ مہذب و شائستہ ضرور ہوں مگر نہ ایسے کہ صرف پاکباز و نیکوکار شریفوں اور بارودربار کی تربیت پائے ہوئے عالموں اور قاضیوں کے سوا دوسروں کی سمجھ سے بالاتر ہوں (کیڑے مکوڑے دور کرنے، پاک وصاف رکھنے اور قوت نمو میں اضافہ کرنے کے لئے ہی شاخ تراشی ہونی چاہیئے مگر نہ اس طرح کہ سرسبز و شاداب پودا کٹ چھٹ کر صرف شاخوں کا پنجر معلوم ہونے لگے) ایسی تدقیق و تنقیح یا تصفیہ و تہذیب اسی وقت مناسب ہے جبکہ سابقہ کسی حکیم یا فلسفی و عالم سے پڑے اور وہ بھی ایسا ہو جو بہت سے الفاظ کو زائد از ضرورت سمجھ کر حذف کر دینے کا عادی ہو کیونکہ ان کے بغیر بھی معنیٰ سمجھنے میں اس کو کوئی دشواری نہیں ہوتی نیز یہ کہ وہ ایسا شخص ہو جو مشترک معنےٰ رکھنے والے الفاظ بھی ترک کرنے کی پابندی کیا کرتا ہو کیونکہ اس سے مدلول متعین نہیں ہونے پاتا۔ تدقیق و تنقیح ہو یا تصفیہ و تہذیب ایسے سامع سے ہونی چاہیئے جس نے منطق محض بحث و تمحیص میں فائدہ اٹھانے کے لئے نہیں بلکہ فن برائے فن کی حیثیت سے

اس میں خصوصی مہارت پیدا کرنے اور اس میں ندرت و طرفگی پیدا کرنے کے لئے حاصل کی ہے۔

اسی صحیفہ میں یہ بھی ہے کہ :۔

مضمون کا حق ادا کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو لفظ بولا جائے وہ اپنے مدلول پر اور ہر اسم اپنے مسمّٰی پر پُورا پُورا منطبق ہو، نہ اس سے زائد ہو نہ اس سے کم۔ موقع و محل بھی اس کے موافق و مناسب ہوں۔ الفاظ کی جہاں جتنی ضرورت ہو وہاں اتنے ہی الفاظ لائے جائیں نہ کم نہ زیادہ۔ یہ ایسے ہوں کہ اپنے معنی ادا کرنے سے قاصر ہوں اور نہ ان میں دوسرے معنی مشترک ہوں نہ متضمن (متضمن کے یہ معنی ہیں کہ بعد کا جُملہ یا بعد کا لفظ سمجھے بغیر پہلا جُملہ یا پہلا لفظ سمجھ میں نہ آئے) ان امور کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ خطیب نے آغازِ کلام میں جو مقصد اپنے پیش نظر رکھا تھا وہ اُس کے ذہن سے نکلنے نہ پائے بلکہ وہ اس کو یاد رہے۔ اپنے کلام کی ابتدا کرتے ہوئے اُس نے جتنی غور و فکر کی تھی اس کے اختتام کے متعلق بھی اسی طرح کی غور و فکر ضروری ہے، اس کے الفاظ نہایت جاذب توجّہ ہونے کے ساتھ ساتھ موقع کی اہمیت کے لحاظ سے ایسے ہوں جن سے سامعین متعارف و مانوس ہوں۔

اثر اندازی و بلاغ کا مبنیٰ و مدار اس پر ہے کہ سامعین کے سمجھنے کی استعداد کے مطابق سمجھایا جائے، ہر طبقہ کو اس کے درجہ و مرتبہ پر رکھا جائے، انھیں اسباب سے کام لیا جائے جو اس کے مناسب ہوں اور اپنے وسائل میں ہر طبقہ اور ہر گروہ کے رنگ و آہنگ کے لحاظ سے ردّ و بدل کیا جائے۔

خطیب کو چاہیئے کہ اپنے نفس سے سوظنی کرنے میں معتدل اور اس سے حسنِ ظن رکھنے میں اقتصاد برتے۔ اگر وہ اپنے آپ پر (اپنے نفس پر) اعتماد نہ کرنے میں ضرورت کی حد سے تجاوز کرے گا تو یہ اپنے آپ پر (اپنے نفس پر) ظلم ہوگا اور اُس کو ایسی ذلت سہنے کے لئے چھوڑ دے گا جیسی کہ مظلوم سہتے ہیں اور اگر اپنے نفس پر اعتماد کرنے میں ضرورت کی حد سے تجاوز کرے گا تو اس کو ایسا ہی بے پروا کر دے گا جیسا کہ ہر طرح سے امن میں رہنے والے (خطروں سے) بے پروا رہتے ہیں۔ اعتماد میں زیادتی ہو یا بے اعتمادی میں دونوں میں غفلت شامل رہتی ہے اور ہر غفلت میں بے پروائی اور ہر بے پروائی میں جہل شریک رہتا ہے۔

اسی صحیفہ کے اُردو ترجمہ میں حتی الامکان عربی متن کی لفظی و اسلوبی پابندی اس لئے کی گئی ہے کہ

ترجمہ در ترجمہ ہو کر اصل مفہوم سے بہت زیادہ بُعد نہ ہونے پائے۔ عربی ترجمہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت زبان میں بلاغت کے یہ ہندی اصول غالباً نظم میں بیان کئے گئے ہیں۔ پاستانی ہند میں علوم و فنون کو مدون کرنے کا عموماً یہی طریقہ رائج رہا ہے۔ عربی ترجمہ سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ بغداد جانے والے اسی ہندی عالم نے بلاغت کے متعلق مختلف اقوال یا مختلف کتابوں کے متعلقہ اقتباس اپنی بیاض میں شاید بطور یادداشت لکھ لئے ہوں کیونکہ تکرار سے قطع نظر فقروں میں طبعی تسلسل ہے اور نہ جملوں میں منطقی ترتیب پائی جاتی ہے۔ آخری جملہ تو ایک عمومی ضابطہ یا اصول ہے بلاغت سے براہ راست اس کا کوئی خصوصی ربط نہیں معلوم ہوتا۔ ویسے ٹھیک ٹھیک بات تو وہی شخص بتا سکے گا جو سنسکرت اور عربی سے واقف ہو، عربی ترجمہ کی اصل سنسکرت کا کھوج لگائے اور دونوں کا مقابلہ کرے۔

اس سلسلہ میں دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ عربی ترجمہ میں لفظ خطبہ و خطیب کئی جگہ آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی میں ترجمہ کرنے والوں کا سہو ہے یا ہندیوں نے اپنے عرب ساتھیوں کو سمجھانے کے لئے یہ لفظ رکھ دیئے ہیں، اصل میں شاید کچھ اور ہوں، یہ شبہ اس لئے ہوا کہ پاستانی ہند کا ادب خطبوں کی وجہ سے کبھی ممتاز نہیں رہا۔ گو جاحظ نے فخر السودان میں ہند میں خطبوں کی موجودگی کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن اس سے اس کی مراد یقیناً یہ نہیں ہے کہ ہند میں خطبے عام ہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اہل ہند خطبوں سے بالکل ناآشنا نہیں ہیں۔ یہاں کا جغرافیائی ماحول ناٹکوں کے لئے تو بہت سازگار رہا ہے مگر خطبوں کے لئے موزوں نہیں تھا۔ ہند جیسے ذیلی براعظم کے بعض علاقوں میں یا سنسکرت ادب میں برائے نام جو چند خطبے ادھر اُدھر پائے جاتے ہیں اُن کے متعلق بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا وہ واقعی خطبے تھے جو فی البدیہہ دیئے گئے۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ با اسلوب خطابت عالموں اور ادیبوں کی غور کردہ تحریریں ہیں اس لئے خطبوں میں جاحظ کسی اور کو عربوں کا ہم سر ماننے کے لئے تیار نہیں چنانچہ عربوں پر شعوبیوں کے (۱۷۹) بعض اعتراضوں کی بے مائگی کا پول کھولتے ہوئے ہندی علوم و آداب کا عربوں کے خطبوں سے مقابلہ کرکے اس نے دونوں کا جو فرق واضح کیا ہے وہ لائق غور و قابل قدر ہے۔

شعوبیوں کا کہنا تھا کہ عرب یہ جو خیال کرتے ہیں کہ ان کے خطبوں کے الفاظ سلیس و صاف

اور ان کی تالیف مربوط اور مضبوط ہوتی ہے اور یہ کہ ان کے معنی و مفہوم گویا حکمت و دانائی کے خزانے ہوتے ہیں تو یہ عربوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ دوسری قوموں میں بھی زبان و بیان کے لحاظ سے بعض خطیب بہت اونچے درجہ کے ہوئے ہیں۔ حکمت و دانائی ہی نہیں بلکہ نہایت گہرے فکری و نظری مسائل بھی ملیں گے۔ ہندی کتابوں میں سورماؤں اور مہاویروں کے کارناموں کے پہلو بہ پہلو واقعات و حوادث کے اسباب و علل کی بڑی نازک بحثیں ملیں گی۔ عرب تو شبانی و شتربانی کرتے رہے ہیں اس لئے ہمیشہ ڈنڈا لئے رہتے ہیں۔ اونٹوں کو ہانکنے ہنکانے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کی زبان میں خشونت اور لہجہ میں کرختگی آ گئی ہے۔ چیخنے چلانے کے ایسے خوگر ہیں کہ اپنی محفلوں میں بیٹھے اخلاص و پیار کی باتیں کرتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ گویا بہروں گونگوں سے مخاطب ہیں۔

جاحظ اس کا جواب دیتا ہے: ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فی البدیہہ خطبہ صرف عربوں کی (۱۸۰) خصوصیت ہے۔ ہندیوں کے پاس پُر از معنی مدونہ پستکیں ہیں، فلسفہ کی پرانی کتابیں بھی ہیں لیکن یہ سب کی سب یا کم از کم ان میں کی اکثر کسی ایک ہی شخص سے منسوب ہیں اور نہ ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی ہیں یہ باپ دادا سے متوارث چلی آ رہی ہیں۔ مدت دراز سے ان ہی کا ذکر بار بار آتا رہتا ہے۔ یہ کتابیں طویل غور و فکر کے بعد تنہائی میں سوچ کر لکھی گئی ہیں، علاوہ بریں ان کی ترتیب و تدوین میں کئی فلسفیوں کی رائیں اور متعدد مفکروں کے مشورے شامل ہیں۔ درس و تدریس کے بعد ان پر شرح و حاشیہ کا اس طرح اضافہ کیا گیا ہے کہ پہلے شخص کا کلام دوسرے شخص سے اور دوسرے شخص کا تیسرے شخص سے مخلوط ہو گیا۔ ایک رسالہ تھا جو مختصر سے مفصل اور مفصل سے مطول ہو کر دفتر بن گیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ پہلوں کی غلطیوں کی دوسروں نے تصحیح کی اور دوسروں کی خامیاں تیسروں نے دور کیں۔ ظاہر ہے کہ صدہا سال کی تو بر تو جمع شدہ تحریروں سے عربوں کی بدیہہ گوئی کا کیا مقابلہ! ان کا یہ حال نہیں ہے۔

عربوں کے بیشتر منظوم کلام کی طرح ان کا خطبہ صرف بدیہہ گوئی، بے ساختگی اور برجستگی ہے۔ خطبہ کیا ہے الہام ہے! اس میں سوچنے دھیان دینے کا دخل نہیں اور نہ اس کے لئے مشقت برداشت کرنے یا مشورہ کرنے کی ضرورت، عرب کا یہ حال ہے کہ کسی نے اس کی مخالفت کی، کسی سے لڑائی ٹھن گئی، کہیں جنگ

برپا ہوئی۔ کسی نے اس کی عزت پر حملہ کیا، کسی نے اس کے قبیلہ کی آبرو لینی چاہی، بس یکایک اس کا غزالِ تخیل چوکڑیاں بھرنے لگا اور اس کے رہوارِ خیال کو ہر میدان تنگ نظر آنے لگا۔ دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں سے چپ چاپ بیٹھا تھا جب زبان کھلی تو اس طرح کھلی کہ مناسب موزوں اور مسجع و مقفّٰی الفاظ کے صاف، شفاف و شیریں چشمے پھوٹ نکلے۔ معنوں کا دریا تھا کہ پہاڑوں سے نکلا اور جس طرف رُخ کیا شور کرتا ہوا نکل گیا۔ کہیں مڑا، کہیں تھما لیکن رُکا کہیں نہیں۔ اس وقت وہ پہلے تولتا پھر بولتا نہیں (لیکن جب سامعین نے اس کی آتش زبانی و شیوہ بیانی کی روانی و ریشہ دوانی دیکھی، جادو کے جُملے و فسوں کے فقرے سنے۔ ع تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے

عرب اپنی کہی ہوئی باتیں اپنے بچّوں کو یاد نہیں کراتا کیونکہ خود اُس نے خطبہ ٹھیر ٹھیر کر نہیں کیا تھا۔ وہ تو امّی تھا اُس کو لکھنے لکھانے سے کیا واسطہ اس کی طبیعت تو بالکل سادہ تھی، اس میں تکلّف نام کو نہ تھا۔ جیّد کلام ہی ان میں زیادہ نمایاں اور زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں کا ہر شخص اپنی زبان پر قادر اور اپنے بیان پر حاکم تھا۔ اُن کے ساتھی کا خطبہ اُن کے لئے سلیس، سہل و رواں تھا۔ ان کو خطبے محفوظ کرنے کی ضرورت تھی نہ اُن کے درس و تدریس کی۔ وہ ایسے نہیں تھے کہ دوسروں کا علم جمع کرتے یا اپنے آباؤ اجداد کے کلام کو مدون کرنے بیٹھتے، جو کچھ انھوں نے یاد رکھا وہ صرف اتنا ہی تھا جو انکے دل کو لگا، جو ان کے سینوں میں اُتر گیا اور جس کو ان کی سادہ عقل نے قبول کیا۔ اس میں کوئی تصنع تھا نہ کوئی تکلّف، بغیر تحفظ و طلب جو یاد رہ گیا رہ گیا۔ سکھانے پڑھانے کی ضرورت اور نہ ضخیم کتابیں مدون کرنے کی حاجت۔

(گنگ و جمن کی لہلہاتی کھیتیوں میں دھونی رمائے ہوئے سادھوؤں کی سوچ بچار یا کرشنا و کاویری کی شاداب وادیوں میں تپشیا کرنے والے جوگیوں کے دھیان گیان سے نجد و حجاز کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں بادِ سموم کے جھکڑ سہنے والے عرب کی بدیہہ گوئی و بے ساختگی و برجستگی کا کیا موازنہ!)

تتمہ

جاحظ جیسے کثیر التحریر و ہمہ گیر ادیب کی تالیفوں میں جن جن اشخاص کے نام آئے ہیں، ان کی تعداد کا ہزاروں تک پہونچنا موجبِ حیرت نہیں ہو سکتا۔ حسب توقع بعض لوگوں کا ذکر سیکڑوں مرتبہ ہوا ہے

اور بعض کا صرف ایک ہی مرثیہ ان میں چند ایسے ہیں جو بظاہر ہندی الاصل معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے متعلق جاحظ نے اشارتاً بھی کہیں کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے ان کی اصل و نسل کا کچھ سراغ لگ سکے۔ بعض اشخاص ایسے بھی نظر آتے ہیں جن کو بعض دوسرے مؤلفوں نے ہندی الاصل لکھا ہے اور بعضوں نے انھیں ایرانی یا رومی نسل کے بتایا ہے اس لئے کسی تذکرہ نویس کے بیان پر اعتماد کرکے بغیر تحقیق کئے انھیں سندھی یا ہندی کہدینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ چند افراد ایسے ضرور ہیں جن کے سندھی یا ہندی ہونے کی شہادت خود جاحظ نے دی ہے۔ ایسے تمام اشخاص کی تعداد چودہ یا پندرہ سے زائد نہیں معلوم ہوتی۔ بہ ترتیب حروفِ تہجی اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) ابوالاصلع (۲) ابراہیم (۳) ابو عطار افلح بن یسار (۴) بازیکرہ (۵) بلہارا (۶) بھلہ (۷) سندباد (۸) سندھی بن شاھک (۹) غانم (۱۰) فلبرنل (۱۱) کرباشش (۱۲) منجح (۱۳) منکہ (۱۴) نصر (۱۵) اور ہارون۔

یہاں ان کے متعلق حسب سابق زیادہ تر وہی معلومات درج کی جائیں گی جو جاحظ کی مطبوعہ کتابوں میں ادہر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔

ہاتھی کی فصل میں ایک جگہ جاحظ نے ہندوستان کی خصوصیتیں بتاتے ہوئے مطیع کے سات اور ابوالاصلع سندھی کے پانچ فخریہ شعر نقل کئے ہیں۔ مطیع اور اس کے اشعار کا ذکر اس مقالہ کے ابتدائی حصہ میں ہو چکا ہے۔ ابوالاصلع کے محولہ اشعار کا مطلب ہے۔ ایسے وقت کہ میدان قتال میں (ہندی تیر یا) ہندیوں کی تیراندازی اپنا کام کر رہی ہے ہندوستان کی مدح کرنے پر میرے (بعض) ساتھیوں کا مجھ پر ملامت کرنا بالکل نامناسب ہے (وہ خوب جانتے ہیں کہ) ہندوستان (ایسا ملک ہے جس) میں ساج و عاج ہے جہاں ہاتھی بکثرت ہوتا ہے۔ جہاں توتیا اتنی کثیر مقدار میں ہوتا ہے گویا (وہاں) توتیا کے پہاڑ ہیں۔ دارچینی وہیں سے آتی ہے اور مرچ وہیں پیدا ہوتی ہے۔

بحر ہزج میں کہے ہوئے ان اشعار کی پہلی بیت یہ ہے:

لقد یعذلنی صحبی   وما ذلک بالا مثل

زکریا قزوینی (م ۶۸۲) نے اپنی کتاب آثار البلاد و اخبار العباد (۱۸۱) میں دس بیتیں اور نقل کی ہیں۔

الحیوان میں اسی سندھی شاعر کی کنیت ابوالاصلع (بروزن افضل) ہے۔ ابن ندیم نے ابوالصلع (صاد مہملہ ولام مفتوح) اور محمد مرزبانی نے (م ۳۸۴) (۱۸۲) ابوالضلع (بضاد معجمہ مفتوح یا مکسور و لام مفتوح) لکھی ہے۔

ابن ندیم کا کہنا ہے کہ اس شاعر کا دیوان تیس اوراق (ساٹھ صفحات) پر مشتمل ہے۔ مذکورہ تینوں مولفوں نے صرف کنیت بتائی ہے نام نہیں لکھا۔ راقم الحروف نے بہت سے مظنونہ مصادر کھنگالے مگر ابوالاصلع کے متعلق کہیں کوئی تفصیل ملی اور نہ اُس کے کوئی اور شعر نظر سے گذرے۔

جاحظ نے ابراہیم بن سندھی بن شاھک کے جو ذاتی اوصاف و حالات بتائے تھے ان کی تفصیل گذشتہ اوراق میں ہو چکی ہے۔ جاحظ نے اس کی چند روایتیں جو ادھر اُدھر بیان کی ہیں اُن سے ہندوستان کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے یہ روایتیں یہاں صرف ایسے ہندیوں کے لئے نقل کی جا رہی ہیں جو اپنے برادرانِ وطن کی باتیں سننے سے کبھی نہیں تھکتے۔

عباس بن محمد (بن علی ابن عبداللہ بن عباس م ۱۸۶) نے علی بن صالح سے اور اس نے ابراہیم بن سندھی سے بیان کیا کہ کسی نے عبداللہ بن عباس (م ۶۸) سے پوچھا: آپ کو یہ علم کس طرح حاصل ہوا؟ اُنھوں نے فرمایا اچھی طرح محفوظ رکھنے والے قلب اور بکثرت سوال کرنے والی زبان کی وجہ سے۔ قلبٌ عقولٌ ولسانٌ سئولٌ (۱۸۳)

جاحظ نے یہی قول الحیوان میں اموی دور کے مشہور نسب داں دغفل سے منسوب کیا ہے لیکن البیان میں لکھا ہے کہ: بعض لوگ قلبٌ عقولٌ ولسان سئولٌ کو دغفل کا قول سمجھتے ہیں مگر دغفل سے زیادہ عبداللہ کیلئے ایسا کہنا زیادہ موزوں ہے۔ ابراہیم جیسے ثقہ راوی کی امانت و دیانت سے قطع نظر حسن بصری (م ۱۱۰) کے قول سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ابن عباس بصرہ آئے، منبر پر چڑھے، سورۂ بقرہ تلاوت کی پھر اس کے ہر ہر لفظ کی تفسیر بیان کی۔ وہ ایک سدا رواں چشمہ تھے۔

جاحظ نے ابراہیم بن سندھی کی یہ روایت ایسے مہمل و مجمل کلام کی مثال میں پیش کی ہے جس میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہوتے ہیں۔

عیسیٰ بن علی بن عبداللہ بن عباس کے صحبت یافتہ ایک شخص نے ابراہیم سے کہا عیسیٰ کہتے تھے کہ: بے فائدہ نظر (غور و فکر) یا وہ گوئی پر ڈال دیتی ہے اور یاوہ گوئی لاحاصل کاموں کا باعث ہوتی ہے۔ یاوہ گوئی کا عادی ہونے کے بعد کوئی شخص اپنی زبان کی اصلاح کرنا چاہے گا تو اس سے ناپسندیدہ باتیں نکلیں گی اور اگر چپ سادہ لینے کا ارادہ کرلے گا تو یہ رکاوٹ یاوہ گوئی سے زیادہ قبیح باتیں کرنے پر مجبور کرے گی (۱۸۴)

یہ روایت بسیار گوئی کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہے۔

صرف زمانہ جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ بعد میں بھی عربوں کے یہاں آواز کا بلند ہونا ایک خوبی سمجھی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ابراہیم بن سندھی نے جاحظ سے کہا کہ: عبدالملک (بن صالح بن علی بن عبداللہ بن عباس م ۱۹۶) رومیوں کی سرحد پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ ان کا وفد آیا۔ عبدالملک نے اپنی فوج میں سے چن چن کر بڑے اونچے قد آور ہٹے کٹے اور بھیانک شکل وصورت کے قوی تن سپاہیوں کو صف بستہ کھڑا کیا۔ وفد کا سردار گفتگو کر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک سپاہی چھینکا۔ چھینک کی آواز معمولی بلکہ قدرے دبی ہوئی تھی عبدالملک نے اس پر غضب آلود نگاہ ڈالی مگر اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وفد واپس ہوا تو چھینکنے والے سپاہی سے کہا: کم بخت! تجھے کیا ہوگیا تھا؟ اگر تیری ناک سکڑی ہوئی تھی یا تیرے نتھنے تنگ تھے تو چھینکنے کے فوراً بعد ایسی دھاڑ مارتا کہ رومی کا دل دہل جاتا۔

لمبے لمبے قدم ڈالنا بھی عربوں کے نزدیک ایک اچھی بات ہے۔ ابراہیم بن سندھی بھی اس کی تصدیق کرتے ہوئے جاحظ کو مطلع کرتا ہے کہ ہارون رشید جب طواف کرتا تو اپنی ازار کے دونوں کونے دائیں بائیں کر کے شترمرغ کی طرح لمبے لمبے قدم ڈالتا تھا۔ ایک بدوی نے اس کو اس حال میں دیکھا تو بے ساختہ بولا: یہ قدم تو ایسے شترمرغ کے ہیں جو گویا رات کے وقت خوف زدہ ہو کر بھاگ رہا ہے (۱۸۵)

عبدالملک بن صالح وغیرہ نے خالد بن برمک کی فراست کا جو واقعہ ابراہیم کو سنایا وہ یوں ہے: ابومسلم خراسانی (م ۱۳۷) کی فوج کا ایک سردار قحطبہ (م ۱۳۲) اور خالد اپنی فوجیں لئے ہوئے شمالی عراق میں

ایک ایسے مقام پر اُترے جہاں سے دشمن کئی میل دور تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا گھوڑوں سے زین و لگام اُتار کر انھیں چرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا اور چولھوں پر ہانڈیاں چڑھا دی گئیں۔ خالد اور قحطبہ قریب ہی ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کمر کھولے بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک خالد کی نظر ہرنوں کے ایک گلہ پر پڑی جو صحرا کی طرف سے آرہا تھا۔ گلہ فوجیوں کی طرف بڑھنے لگا تو خالد فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور قحطبہ سے کہا: امیر! فوج کو فوراً سوار ہونے کا حکم دیجئے دشمن ہمارے قریب ہے۔ دیر مت کیجئے۔ بس اب کوئی دم میں آتا ہی ہے۔ قحطبہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ نظر دوڑائی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا۔ تم بے وجہ خوف زدہ ہو۔ فوج ہوتی تو گرد و غبار ضرور دکھائی دیتا خالد نے کہا: امیر! باتوں میں وقت نہ گنوائیے فوراً سوار ہونے کا حکم دیجئے۔ ابن صالح کہتا ہے۔ واللہ! اہل فوج پوری طرح گھوڑوں پر سوار بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ گرد اُٹھی اور اُس کے پیچھے ہی دشمنوں کا دستہ نمودار ہوا۔ اگر خالد کی نظر کام نہ کرتی اور اس کی فطانت نہ ہوتی تو ہم ان سے مارے جاتے (۱۸۶)

ابن سندھی کی روایتیں ختم ہو چکیں صرف ایک نادرہ رہ گیا وہ بھی سن لیجئے (۱۸۷)

ابراہیم کہتا ہے: بغداد کے قریب شاذروان نامی مقام کا خراسانی حاکم میرا شناسا تھا۔ عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے اخلاق پاکیزہ اور اطوار پسندیدہ تھے، رشوت کبھی نہیں لی، سفارش کبھی نہیں سنی، قانون کے مطابق چلتا اور فصل خصومات میں اپنے ذاتی رجحان و میلان کو کبھی دخل انداز نہیں ہونے دیتا لیکن ان کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ صرف اتنا ہی کھاتے جس سے جسم و جان متحد رہ سکیں، ایسی ہی چیز نوش فرماتے جو ناگزیر ہوتی کچھ پیتے تو بس اتنا ہی جس سے حلق تر ہو جائے۔

البتہ ان کی خصلتوں میں ایک چیز بڑی عجیب و غریب تھی۔ کرتے یہ تھے کہ ہر جمعہ پہلے پہر گھر سے نکلتے۔ ایک صاف ستھرے کپڑے میں دو روٹیاں اور دم دیئے ہوئے گوشت کے کچھ ٹکڑے اس میں باندھ لیتے کچھ سبزی از قسم پودینہ وغیرہ ضرور ہوتی تھی اس کے ساتھ تھوڑا سا پنیر اور چند دانے زیتون بھی رکھتے۔ اُبلے ہوئے چار انڈے تو لازماً ہوا کرتے تھے۔ ایک چھوٹی سی تھیلی میں تھوڑا سا نمک، مٹی میں ہاتھ صاف کرنے کی چیز کے علاوہ خلال بھی ساتھ ہوتا تھا۔ غرض یہ سب چیزیں لئے گھر سے تن تنہا نکلتے۔ کرخ کے کسی باغ میں آتے۔ ہرے بھرے مقام پر کسی نہر کے کنارے کوئی گھنا سایہ دار درخت تلاش کر کے اس کے نیچے بیٹھ جاتے۔ کپڑا بچھاتے۔ کھانے کی جو

چیزیں ساتھ ہوتیں انھیں سلیقہ سے اس پر چنتے۔ پھر اطمینان سے کبھی اس پر ہاتھ ڈالتے کبھی اس پر۔ اس اثنار میں اگر باغ کا کوئی مالی یا رکھوالی سامنے سے گذرتا تو اس کی طرف ایک درہم پھینک کر کھجور کا موسم ہوتا تو کہتے اس کے کھجور لے آ۔ انگور کی فصل ہوتی تو فرماتے انگور لے آ۔ پھر بار بار تاکید ہوتی۔ دیکھ! میری پاس داری نہ کر۔ ہاں اچھے سے اچھا میوہ لائیو۔ اگر اچھے سے اچھا میوہ خریدنے میں تو نے میرا لحاظ کیا اور اپنی طرف سے کچھ خرچ کیا تو میں اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا بلکہ آئندہ تجھ سے ایسا کوئی کام بھی نہ لوں گا۔ مگر اس میں سے اپنے لئے کچھ دبا نہ بیٹھنا جس کا مال غبن ہوجاتا ہے اس کی کوئی تعریف کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی اجر ہے۔

اگر مالی یا کاماٹی انگور یا کھجور لے آتا تو پھر قبلہ خود تو کھاتے ہیں لانے والے کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے بلکہ اپنے ساتھ جو چیزیں پہلے سے ہوتیں اس میں بھی اس کو شریک فرماتے۔

تناول ماحضر سے فارغ ہوکر خلال فرماتے، ہاتھ دھوتے پھر سو پون سو قدم ٹہل کر کروٹ لیٹ جاتے اور جمعہ کی نماز کے وقت تک استراحت فرماتے۔ پھر بیدار ہوتے، وضو کرتے اور مسجد تشریف لے جاتے یہ تھی اُن کی دیرینہ خصلت۔ سالہا سال سے وہ ہر جمعہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

ابراہیم کہتے ہیں: ایک روز کیا ہوا۔ حضرت قبلہ تناول طعام میں مصروف تھے۔ سامنے سے ایک راہ گیر نے سلام کیا۔ شیخ نے سلام کا جواب دیا پھر فرمایا آیئے کھانا حاضر ہے! اللہ آپ کو اچھا رکھے! جب دیکھا کہ راہ رو لوٹ کر نہر پھلانگنا یا روش اولانگنا چاہتا ہے تو کہا ٹھیرو! ٹھیرو!! عجلت شیطان کا کام ہے!!

وہ شخص رُک گیا۔

خراسانی شیخ خود ہی آگے بڑھا اور پوچھا: تم کیا چاہتے ہو؟

ناشتہ کرنا چاہتا ہوں۔

یہ کیوں؟ تمہیں ایسی طمع کیوں ہوئی؟ تمہارے لئے میرا مال کس نے مباح کیا؟

اجنبی ہکا بکا ہوگیا اور حیرت سے پوچھا: کیا آپ نے مجھے کھانے کے لئے نہیں بُلایا؟

ارے کمبخت! اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ تم ایسے احمق ہو تو تمہارے سلام کا جواب ہی نہیں دیتا۔ آداب

یہ ہیں کہ اگر میں بیٹھا ہوا رہوں اور تم گذر رہے ہو تو تم سلام کرتے اور میں اس کا جواب بھی سلام ہی سے دیتا۔ اگر میں کھانے پر نہ ہوتا تو خاموش رہتا اور تم بھی ساکت رہتے اور اپنی راہ لیتے، میں اپنی جگہ بیٹھا رہتا اور اگر میرے سامنے کھانا ہوتا تو صورتِ حال دوسری تھی اور وہ یوں کہ میں کہتا آیئے کھانا حاضر ہے اور تم جواب دیتے خدا اس کو خوشگوار و مفید بنائے تو قول کا جواب قول سے ہو جاتا لیکن کلام کا بدل کام اور قول کا بدل فعل !! یہ تو انصاف نہیں ہوا۔ میں نے جو آداب بتائے اسی میں بھلائی ہے۔

ابراہیم نے کہا: راہ گیر کو خراسانی سے ایسا جواب سننے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ شدہ شدہ پورے علاقہ میں یہ بات مشہور ہو گئی۔ لوگوں نے شیخ سے کہا۔ ہم سلام کر کے آپ کو اس کے جواب کی زحمت سے سبک بار کر دیں گے۔ شیخ نے کہا۔ اس کی کیا ضرورت؟ سلام کیوں ترک کیا جائے؟ البتہ میں خود ہی "آیئے کھانا حاضر ہے" کہنے کی تکلیف سے اپنے آپ کو سبک دوش کر لیتا ہوں۔ بات اپنی جگہ ٹھیک ہو گئی !!

ابراہیم بن سندھی کی سبھی باتیں اچھی تھیں اللہ اس پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔

ابو عطاء افلح بن یسار کا شمار اپنے وقت کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے اس کا باپ یسار قبیلہ بنی اسد کا غلام تھا۔ افلح بنو امیہ کے آخری دور میں پیدا ہوا اور کوفہ میں نشو و نما پائی۔ بنو امیہ کے مداحوں میں تھا منصور کے آخری زمانے تک زندہ رہا۔ بنو ہاشم کی ہجو کہنے کی وجہ سے دربار میں بار نہ پا سکا۔

نثر ہو یا نظم عربی ادب کی قریباً ہر اساسی کتاب میں اس کا کچھ نہ کچھ کلام پایا جاتا ہے مگر اس کے دیوان کا اب تک کہیں پتہ نہیں لگ سکا۔ حال میں علامہ عبدالعزیز راج کوٹی کے ایک شاگرد بخش بلوچ نے مختلف کتابوں سے جتنا کلام مل سکا اکٹھا کر کے حیدرآباد دکن کے سہ ماہی رسالہ اسلامک کلچر بابت سنہ انیس سو انچاس میں شائع کرایا ہے۔

یہاں ابو عطاء سندھی کے تفصیلی تعارف کی اس لئے ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ البیان میں عبیداللہ کندی کی ہجو میں دو اور اپنے ایک بدتمیز مہمان کی ہجو میں وہ اور الحیوان میں ایک اس طرح صرف پانچ شعر نقل کرنے کے سوا جاحظ نے اس سندھی شاعر کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔

بازیکرہ۔ اس کے متعلق جاحظ نے سوائے اس کے کہ یحییٰ بن خالد کے بلائے ہوئے ہندی طبیبوں میں شامل

تھا اور کچھ نہیں لکھا ۔ عبدالرزاق کا کہنا ہو کہ اصل لفظ بجئے گر تھا (۱۸۸)

بلھارا ۔ پراکرت لفظ بلّا ہارا کی تعریب ہو ۔ یہ راشٹرکوٹا خاندان کے کئی بادشاہوں کا لقب رہا ہے ۔ لفظی معنی محبوب الہٰی ہیں ۔ راشٹرکوٹا خاندان سات سو چون عیسوی سے نو سو چوہتر عیسوی تک حکمراں رہا ۔ اس خاندان کے راجاؤں کی تعداد دس بتائی جاتی ہو ان کا صدر مقام ملکھیڑ واقع مغربی دکن تھا ۔ شمال میں گجرات اور جنوب میں کوکن تک کا پورا مغربی ساحل اسی خاندان کے قبضہ میں تھا عراق سے ہندوستان کی تجارت راشٹرکوٹی بندرگاہوں سے ہوتی تھی اس لئے ہندی تاجروں کی بصرہ میں آمد و رفت رہتی تھی اور وہ عربوں کو یہاں کے عجیب عجیب قصّے سُنایا کرتے تھے ۔ راشٹرکوٹی خاندان میں سب سے پہلے کسی راجہ نے بلھارا کا یہ لقب اختیار کیا خود ہندی بھی نہیں بتا سکتے تھے ۔ اسی لئے ابن عبدالوہاب سے جاحظ نے سوال کیا ہے کہ بتاؤ تو سہی بلھارا کس حکمراں کا نام ہو ۔؟ (۱۸۹)

بھلّہ کے متعلق اوپر گذر چکا ہو کہ یہ بھی ایک ہندی طبیب تھا اور ادب سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لئے اس نے بلاغت کے ہندی اصول کا ترجمہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی ۔

سند باد بھی ایک ہندی طبیب کا نام ہو جو یحییٰ بن خالد کے طلب کئے ہوئے حکیموں کے وفد میں شامل تھا عبدالرزاق اس کو سندھ باد کی تعریب سمجھتے ہیں (۱۹۰)

سندھی بن شاہک کے حالات پچھلے صفحوں میں بیان ہو چکے ہیں تفصیل میں گئے بغیر اگر ہم صرف انہیں واقعات پر ایک نظر ڈال لیں جو جاحظ نے نقل کئے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی شہنشاہوں کے معنوی وارث عباسی خلفاء کے یہاں ہندی طریق حکمرانی کے واقف حال سندھی بن شاہک کا درجہ و مرتبہ قریب قریب ایسا ہی تھا جیسا کہ سندھ و ہند کے مطلق العنان ادھیراجوں و مہاراجوں کے یہاں راجگوں اور مہامنتریوں کا ہوتا ہو ۔ عباسی خلفاء کے دبدبہ و شوکت اور اُن کے ذاتی جاہ و جلال کے واقعات وہ خود (سندھی) بہت فخر سے بیان کرتا تھا ۔ اپنے بیٹے سے کہتا ہو : ایک مرتبہ بنو ہاشم کا ایک نوجوان منصور کے پاس حاضر ہوا ۔ منصور نے اس سے اس کے باپ کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو نوجوان نے کہا : اللہ اس سے راضی ہو فلاں دن بیمار پڑا ، فلاں دن اُس نے وفات پائی رضی اللہ عنہ ۔ اتنا مال چھوڑا اور اتنی اس کی اولاد ہو رضی اللہ عنہ

یہ سن کر منصور نے تو کچھ نہیں کہا؛ لیکن اس کے حاجب نے ہاشمی کو جھڑک کر کہا: یہ کیا بے ادبی ہے؟ امیر المومنین کا مواجہ اور اپنے ہی باپ کے لئے بار بار دعا۔ (۱۹۱)

ایک دوسرے ہاشمی کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اور بھی عبرت خیز ہے۔ ہوا یہ کہ منصور کے یہاں محمد بن عیسٰی بن علی حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز منصور نے اس کو بیٹھنے کا حکم دیا اور دسترخوان بچھا تو کھانے پر بُلایا۔ ابن عیسٰی نے کہا: میں کھانا کھا چکا ہوں۔ یہ کہتے ہی منصور کے حاجب ربیع نے اس کو پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ ابن عیسٰی ہٹ تو گیا مگر چہرے سے مجھے (سندھی) اندازہ ہوا کہ اس نے اپنی غلطی محسوس نہیں کی۔ بہرحال جب ہاشمی جانے کے لئے اُٹھا تو ربیع بھی اس کے پیچھے ہو لیا اور جب وہ سراپردہ سے باہر گیا تو ربیع نے اس کی گردن پر ہاتھ مار کر ایک دھکا دیا۔ حاجبوں نے دیکھا تو انھوں نے بھی ابن عیسٰی کی گردن پر مکّے رسید کرتے ہوئے اس کو بارگاہ سے نکال دیا۔

دوسرے روز ہاشمی کے چچیرے قرابت داروں نے منصور سے ربیع کی شکایت کی تو منصور نے کہا ربیع نے ایسی حرکت بلا وجہ نہیں کی مناسب ہے کہ تم اس کے سلوک کو برداشت کرو ورنہ میں تمہارے مواجہ ہی میں اس سے پوچھوں گا۔ مگر اس میں تمہاری سُبکی ہوگی۔ ان لوگوں نے سر دربار ہی ربیع سے پوچھنے پر اصرار کیا تو منصور نے ربیع کو طلب کیا اور ان لوگوں نے اس کی شکایت کی۔ ربیع نے کہا ابن عیسٰی دور ہی سے سلام بجالاتا اور چلا جاتا تھا امیر المومنین نے اس کو اپنے قریب بُلایا بیٹھنے کا حکم دیا، اس کے سامنے دسترخوان بچھوایا اور ہم طعامی کا شرف بخشنا چاہا لیکن ابن عیسٰی ایسا گنوار تھا کہ اس فضیلت کا کوئی خیال نہیں کیا یہ تک کہہ دیا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ گویا وہ یہ سمجھتا ہو کہ امیر المومنین کے پاس کھانا کھانا محض بھوک پیاس بجھانے کے لئے ہوتا ہو۔ ایسے شخص کی اصلاح بات سے نہیں ہوتی اس کے لئے لات چاہیئے۔

(باقی)

ضروری گذارش

غیر ملکی اور پاکستانی ممبران ادارہ اور خریداران رسالہ بُرہان سے کئی سال کی فیس وصول نہیں ہوئی ہو۔ ایسے حضرات کی خدمت میں بل ارسال کیے جا رہے ہیں سعی فرما کر بل کے مطابق رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ ارسال فرمائیے۔ منیجر۔